افلاطون کا نظریہ شعر اور ارسطو کا ردِ عمل

ڈاکٹر شیر علی☆

Abstract:

Plato has not expressed his critical views and ideas in any of his books.Some hints and rules can be found in his books which are written for the gauidence of a society.Plato' s theory of imitation is a general theory which is encircling art and literature.For him poetry is created under a trance of some muse so poets are untrustworthy for social stability. Aristotle on the other hand has given a new and positive meanings to imitation by calling it a creative activity.For him imitation is not merely blind imitation.It stands for some addition or beautification of imitation.

افلاطون نے اپنے تنقیدی آرا کا اظہار تفصیل سے نہیں کیا۔ سیاسیات، اخلاقیات اور مابعدالطبیعیات کی ذیل میں ادبی تنقید کے چند اصول بھی مل جاتے ہیں ۔اس کی کتابیں بالخصوص ''ریاست'' (Republic) اور ''قانون'' (Laws) انحطاط پذیر معاشرے کی رہنمائی کے لیے لکھی گئیں اور اسی رہنمائی کے سلسلے میں شاعری، اس کے معاشرتی منصب اور اس کی قدر کے بارے میں بھی کسی قدر بحث ملتی ہے ۔افلاطون کا زمانہ معاشرتی منصب اور اس کی قدر کے بارے میں بھی کسی قدر بحث ملتی ہے ۔افلاطون کا زمانہ معاشرتی انحطاط کا زمانہ تھا اور شاعری کا انحطاط بھی پورے معاشرتی انحطاط پر محض اس حد تک نظر رکھتا ہے جس حد تک ادب اور شاعری اسے معاشرتی فلاح و بہبود اور عام معاشرتی اخلاقیات پر اثر انداز ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے ۔

☆ اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، الحمد اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد

افلاطون کا نقل تصور

افلاطون شاعری کو مصوری سے مشابہہ سمجھتا ہے یوں کہ دونوں اشیا کی تقلید کرتی ہیں، ایک لفظوں کے ذریعے اور دوسری رنگوں کے ذریعے۔ شاعر اور مصور جو کچھ پیش کرتے ہیں، وہ اس طرح کی اصل اور ٹھوس چیزیں نہیں ہوتیں جیسی کہ دوسرے اہل حرفہ و کاری گر پیش کرتے ہیں۔ شاعروں اور مصوروں کی پیش کش محض ان ٹھوس اشیاء کی نقل و تقلید ہوتی ہے اور اس طرح یہ دونوں قسم کے فن کار حقیقت سے پیچھے ہو جاتے ہیں مگر افلاطون کا نظریہ یہ ہے کہ اہل حرفہ کی مصنوعات بھی اصل نہیں ہوتیں وہ بھی اس خیال (Idea) یا ہیئت (Form) کی نقل ہوتی ہیں جو بنانے والے کے ذہن میں موجود ہوتی ہیں۔ البتہ کاری گر اور اہل حرفہ الحاظ سے حقیقت سے قریب تر ہوتے ہیں کہ وہ جس چیز کو بناتے ہیں اس کے بارے میں علم ضرور رکھتے ہیں اس کے برعکس شاعر اہل حرفہ کی نقل کی نقل کرتا ہے اور اس طرح وہ اصل حقیقت سے دو قدم پیچھے ہوتا ہے۔ مختصراً یہ کہ افلاطون کا شاعروں پر اعتراض یہ ہے کہ وہ محض موہوم عکس پیش کرتے ہیں۔ ایسا عکس جو کوئی شخص فطرت کو آئینہ دکھا کر حاصل کر سکتا ہے۔ یہ عکس خارجی شکل یا ہیولے کو اصل شے بنا کر پیش کرتا ہے اور غیر حقیقی کو حقیقت کا روپ دیتا ہے۔ وہ لوگ جو اس غیر حقیقی دنیا کے برعکس ہوتے ہیں، خود واہمہ کی دنیا میں رہتے ہیں اور اسی دنیا میں وہ تمام لوگوں کو آنے کی دعوت دیتے ہیں۔(۱)

Martin Gray نے اس اصطلاح کی یوں وضاحت کی ہے:

> "Imitation is the Keyword in MIMETIC views of literature which follow Aristotle in regarding poetry as a "imitation" of human actions. Literature holds a mirror up to life, or is a "True" model of life. Again this view was common until the end of the eighteenth century, though what literature should imitate, and how, were subjects for Controversy. (2)

ڈاکٹر جمیل جالبی افلاطون کے نظریہ نقل کو ان الفاظ میں واضح کرتے ہیں کہ مابعد الطبیعیاتی نقطہ نظر سے وہ جس چیز کی نقل کرتا ہے وہ حقیقت سے دو درجہ دور ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل افلاطون یہ بتاتا ہے کہ ایک ایسی شے کے بارے میں جس کا ایک نام بھی ہو، یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اس کی ایک مشترک صورت بھی یقیناً ہوگی اور یہ مشترک صورت ایک مشترک خیال کا مظہر ہوگی۔ افلاطون کے نزدیک ''حقیقت'' کسی چیز میں نہیں ہوتی بلکہ اس کے ''خیال'' میں ہوتی ہے۔ فلسفی کا کام یہ ہے کہ وہ کسی منفرد ''شے'' سے ''خیال'' تک پہنچے۔ شاعر ''خیال'' تک نہیں پہنچتا۔ بل کہ اسی شے میں محو رہتا ہے اور اسے بھی غلط طریقے سے پیش کرتا ہے۔ اپنی اس بات کو افلاطون پلنگ کی مثال سے واضح

کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ دنیا میں لاتعداد پلنگ ہیں جنھیں مختلف بنانے والوں نے بنایا ہے لیکن ان سب پلنگوں کی اصل وہ مثالی پلنگ ہے جس کی صورت خدا کے ذہن میں ہے۔ بڑھئی جب پلنگ بناتا ہے تو وہ اسی مثالی پلنگ کی نقل کرتا ہے۔ جب ایک مصور پلنگ بناتا ہے تو وہ بڑھئی کے پلنگ کی نقل کرتا ہے۔ یعنی اس طرح مصور نقل کی نقل کرتا ہے اور حقیقت سے دو درجے دور ہو جاتا ہے۔ اسی طرح شاعر بھی جب اس پلنگ کو بیان کرتا ہے تو وہ بھی مصور کی طرح حقیقت سے دو درجہ دور ہو جاتا ہے۔(۳)

ڈاکٹر سید عبداللہ نے اس تصور کی مزید وضاحت کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ افلاطون کے تصور کے مطابق عالم دو ہیں۔ ایک وہ جو حقیقی اور ابدی ہے جس میں کوئی تغیر رونما نہیں ہو سکتا۔ یہ عالم تصورات یا عالم مثال ہے۔ دوسرا وہ جو نمود، تغیر اور زمان کا مظہر ہے۔ یہ عالم حواس ہے۔ دوسرے عالم کی ہر شے پہلے عالم کے کسی تصور کشی کرتا ہے یعنی نقل پیش کرتا ہے لہٰذا شاعری نقل کی نقل ہے چناں چہ سب شاعر جن میں ہومر بھی شامل ہے، نقال ہیں۔ وہ چیزوں کی نقالی کر سکتے ہیں لیکن کوئی حقیقی چیز تخلیق نہیں کر سکتے۔ مختصراً شاعری تخلیق حقیقت نہیں بل کہ عالم مثال کا عکس اور نقالی ہے لہٰذا نہایت ہی کم تر درجے کا عمل ہے۔(۴)

اس کے باوجود افلاطون اپنے ان تصورات سے بالاتر ہونے کی کوشش بھی کرتا ہے۔ نقالی یا تقلید کا یہ عام نظریہ عام شاعری تک محدود ہے۔ مگر افلاطون ایک اعلیٰ قسم کی شاعری کا تصور بھی رکھتا ہے۔ فلسفیانہ نقطہ نظر سے وہ حواس کی دنیا کے پیچھے ایک مثالی دنیا کا تصور رکھتا ہے اور اس مثالی دنیا کے تصورات مثلاً عدل، حسن اور صداقت کی تقلید کو اعلیٰ انسانی کردار کے لیے ضروری خیال کرتا تھا۔ لہٰذا شاعری میں انھی اعلیٰ مثالی اقدار کی تقلید اس کے نزدیک اعلیٰ شاعری کا موجب بن سکتی تھی۔ اس بات کا مطلب یہ بھی ہوا کہ ایسی شاعری جو یہ دیکھنے کی بجائے کہ اشیا کیا ہیں، یہ دیکھتی ہے کہ انھیں کیا ہونا چاہیے۔ افلاطون کے نزدیک مستحسن شاعری ہے اور تقلید کا یہ مفہوم افلاطون کے نزدیک اعلیٰ تر مفہوم ہے۔

شاعری کی ماہیت کے بارے میں تقلید کے تصور سے قطع نظر، افلاطون کا دوسرا تصور تحریک شعر کا تصور ہے۔ سارے قدیم یونانی شعرا کا یہ خیال تھا کہ وہ کسی دیوتا یا فن کی دیوی کے زیر اثر ایک قسم کی جنونی کیفیت میں یا آسیب زدگی کی حالت میں شعر کہتے ہیں۔ قدیم یونانی شاعر پنڈار (Pindar) بھی اس بات کو مانتا تھا کہ شعرا کسی بیرونی طاقت سے تحریک پا کر عالم وجد میں شعر کہتے ہیں۔ افلاطون نے اس نظریے کو بھی اپنا لیا۔ گو اس کے عہد کا عام نظریۂ شعر یہی تھا کہ شاعری بھی دیگر فنون کی طرح شعوری فن ہے اور شاعر لفظوں کے شعوری استعمال سے تاثر پیدا کرتا ہے چوں کہ افلاطون تحریک شاعری کے غیر شعوری اور غیر عقلی تصور کو بھی مانتا تھا اس لیے وہ اس نتیجے پر پہنچ کہ شاعری کے پیچھے بے پناہ غیر شعوری اور غیر عقلی صلاحیتیں کارفرما ہوتی ہیں اور اسی لیے شاعر کا کلام ذمہ داری کا نہیں بلکہ غیر ذمہ داری کا اظہار ہوتا ہے۔ لیکن افلاطون اپنی کتاب ''فیدریوس'' (Phaedrus) میں تحریک شعری کو عظیم تر مفہوم بھی دینے کی کوشش کرتا ہے۔

اس کا خیال ہے کہ شعری تحریک کے سبب ایک ایسا ترفع نصیب ہوتا ہے جو عام حالات میں ممکن نہیں۔اس بات کی تشریح کرتے ہوئے افلاطون کہتا ہے:

''جنون دو قسم کے ہوتے ہیں۔ایک وہ جو کسی جسمانی خرابی یا ذہنی عدم توازن کا نتیجہ ہوتا ہے اور دوسرا وہ جس میں روح روزمرہ کے عوامل اور معاملات دنیوی کی قید و بند سے آزاد ہو جاتی ہے۔''(۵)

اس دوسرے قسم کے ترفع کی وضاحت میں وہ پیغمبر، شاعر اور عاشق کی مثال دیتا ہے۔اس کا خیال ہے کہ عاشق کی روح ان اعلیٰ وارفع، غیر متغیر حقیقتوں کی طرف پرواز کرتی ہے جن سے لافانی روح کا فی الواقعی رشتہ ہوتا ہے۔روح حسن کی تلاش میں مثالی حقائق کی طرف پرواز کرتی ہے اور بالآخر صداقت تک پہنچ کر جو خود تمام تر حسن ہوتی ہے، روح کا یہ سفر ختم ہو جاتا ہے۔شعری وجدان یا تحریک شعر کے متعلق بھی وہ اسی قسم کی بات کرتا ہے۔افلاون کا خیال ہے کہ اس تحریک کے باعث شاعری کی دبی ہوئی قوتیں باعمل ہو جاتی ہیں اور شاعرانہ وجدان بیدار ہو جاتا ہے اور اس طرح شاعر کو مثالی صداقتوں کا علم ہو جاتا ہے۔

ارسطو کا تصورِ شعر

شاعری کی ماہیت کے بارے میں ارسطو افلاطون کے خیالات کو دہراتے ہوئے یہ بتاتا ہے کہ شاعری اور دیگر فنونِ لطیفہ میں بہ سی اقدار مشترک ہیں۔شاعری بھی اور فنون کی طرح ایک ''تقلیدی فن'' ہے۔گو ارسطو نے تقلید کی اصطلاح افلاطون سے ہی مستعار لی مگر وہ اسے نئے مفاہیم عطا کرتا ہے۔ارسطو کے عطا کردہ مفہوم کے تحت شاعری محض واقعاتی حقیقتوں اور موجودا شیا کی نقالی نہیں رہ جاتی بلکہ شاعرانہ عمل ایک تخلیقی بصیرت کا حامل ہو جاتا ہے۔اسی تخلیقی بصیرت کے سبب شاعر واقعاتی دنیا میں اپنے موضوع کی تلاش کرتا ہے اور موجود واقعات اور حقائق سے کوئی نئی چیز تخلیق کرتا ہے۔شاعر اپنے مواد کو برتتے وقت اشیا کو اس طرح پیش کرتا ہے جیسے وہ اشیا تھیں یا ہیں یا جیسا کہ ان کے بارے میں کہا جاتا ہے یا تصور کیا جاتا ہے یا پھر ان اشیا کو یوں ہونا چاہیے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ شاعر ماضی و حال کے واقعات و حقائق کو استعمال کرتا ہے اور مروّج خیالات و تصورات کو برتتا ہے یا پھر غیر موجود تصوراتی حقیقتوں کو حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ایک نئی صورت و ہیئت عطا کا عمل ان تینوں طریقوں میں مضمر ہے اور ارسطو کے نزدیک عمل تقلید تخلیق نو کے مترادف ہے۔عمل تقلید کو ایک تخلیقی عمل بتا کر ارسطو نے ادبی نظریات میں ایک اہم تصور کا اضافہ کیا۔اس طرح وہ شاعری کو انسانی زندگی کی مستقل، ہمہ گیر اور آفاقی خصوصیات کی تقلید یا بہ الفاظ دیگر ان کا اظہار سمجھتا ہے۔ارسطو شاعری کو نہ تو محض نقالی اور تقلید سمجھتا ہے اور نہ محض واہمہ اور فریب نظر۔جس طرح شاعری محض نقالی اور تقلید سے مختلف ہے، اسی طرح وہ محض واہمے اور فریب نظر سے بھی مختلف ہے۔شاعر روزمرہ کی زندگی کے انتشار

سے ایک منضبط اور منظم ہیئت پیدا کرتا ہے جس میں انسانی فطرت کی مستقل خصوصیات اظہار پاتی ہیں اور متشکل ہوتی ہیں۔انسانی فطرت کی یہ مستقل خصوصیات آفاقی اور مثالی صداقتوں کا درجہ رکھتی ہیں۔(۶)

اس بحث کے سلسلے میں ڈاکٹر جمیل جالبی ارسطو کے تصور کو مزید اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ بوطیقا کے مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ارسطو کا ذہن منطقی، اس کا مزاج سائنسی اور اس کی فکر معروضی ہے۔اس کی نظر بیک وقت تمام فنون پر ہے اور وہ دیکھتا ہے کہ سارے فنون زندگی کی نقل (Mimesis) ہیں۔ یہ اصطلاح افلاطون سے لی گئی ہے۔افلاطون کے ہاں شاعرانہ نقل حقیقت سے دو درجہ دور ہو جاتی ہے۔شاعر عکس کے عکس کا پجاری ہے لیکن ارسطو کے ہاں یہ ایک قدرتی عمل ہے۔افلاطون عینیت پر زور دیتا ہے۔ارسطو واقعیت پر زور دیتا ہے۔ارسطو کے نزدیک سارے فنون نقل کی صورتیں ضرور ہیں لیکن ان صورتوں میں فرق تین وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ایک تو اس وجہ سے کہ سارے فنون نقل کے ایک دوسرے سے مختلف ذرائع استعمال کرتے ہیں۔دوسرے اس وجہ سے کہ یہ مختلف چیزوں کی نقل کرتے ہیں اور تیسرے اس وجہ سے کہ یہ نقل کے مختلف طریقے استعمال کرتے ہیں۔یعنی ذرائع، اشیا اور طریقے کے فرق سے ایک فن دوسرے فن سے، نقل کے بنیادی اشتراک کے باوجود، مختلف ہو جاتا ہے۔(۷)

ارسطو پہلا مفکر تھا جس نے چند خالصتاً جمالیاتی اصول قائم کیے۔افلاطون نے مطالعہ فن اور مطالعہ اخلاق کو ایک چیز قرار دیا تھا۔لیکن ارسطو نے دونوں میں امتیاز کر کے جمالیات کے علم کی گویا بنیاد رکھی۔ارسطو کے لیے ہر فن پارہ، چاہے وہ نظم ہو یا تصویر، ایک حسین شے ہے، اس سے ایک خاص قسم کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔جب ہم کسی نظم کو اچھا کہتے ہیں اس سے مراد نظم کا حسن ہوتا ہے۔یعنی لفظ اچھا اخلاقی معنی میں نہیں بلکہ جمالیاتی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے۔ارسطو نے ادب کی بنیادی خصوصیات کا تجزیہ کیا اور یہ دکھانے کی کوشش کی کہ یہ ایک سنجیدہ اور مفید عمل ہے۔ یہ لغو اور خطرناک نہیں جیسا کہ افلاطون نے ثابت کیا تھا۔ارسطو کا طریق کار سائنسی تھا، وہ جس جماعت کا مطالعہ کرنا چاہتا تھا، اس کے سب افراد کے خصائص دریافت کرتا تھا۔اس طرح اسے ان خصوصیات کا پتہ چل جاتا تھا جو ایک جماعت کے سب افراد میں مشترک ہوتی تھیں۔ایسی خصوصیات کو وہ بنیادی قرار دیتا تھا جن سے اس جماعت کی حقیقت اور اس کے جوہر کا پتا چلتا ہو۔ایک سائنس دان کی طرح جو ہے وہ اس کا تجزیہ کرتا ہے اور جو ہونا چاہیے اس سے بحث نہیں کرتا۔مثلاً ادب کے سلسلے میں ارسطو کا مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ادب کیا ہے؟ اسے اس سے بحث نہیں کہ ادب کیا ہونا چاہیے۔

ارسطو کا خیال یہ بھی ہے کہ فن سے ہمیں مسرت حاصل ہوتی ہے اس کی وجہ یہ کہ انسان اصل کی نقل کو دیکھ کر طبعاً خوش ہوتا ہے۔نقالی کا نظریہ افلاطون نے پیش کیا تھا مگر افلاطون سے ارسطو یوں مختلف ہو جاتا ہے کہ افلاطون فن کو (شاعری وغیرہ کو) اصل کی نقالی نہیں مانتا، اصل کی نقل کی نقل مانتا ہے، عکس کا عکس کہتا ہے، لیکن ارسطو اس کو اصل (جیسی کہ فن کار کے تصور میں آئی) کی نقل مانتا ہے۔

ارسطو کے متعلق یہ غلط فہمی ہے کہ اس کے نزدیک فن اصل کی ہو بہو نقل ہے۔ارسطو یہ تو مانتا ہے کہ فن انسان کی سیرتوں کی عمومی خصوصیات کو پیش کر کے مع شے زائد پیش کرتا ہے لیکن محض تکرار کوئی خاص چیز نہیں۔اس کے علاوہ اس

کے نزدیک محض پیش کرنا بھی مقصد نہیں بلکہ ایسے طریقے سے پیش کرنا مقصود ہے جس میں جمالیاتی عنصر یعنی ہیئت اور ادا کا حسن پیدا ہو اور یہی وہ شے ہے جو محظوظ کرتی ہے محض نقالی محظوظ نہیں کرتی۔ دراصل یہ غلط فہمی ارسطو کے ان جملوں سے پیدا ہوئی ہے:

۱۔ ''نقل میں اصل کو پہچاننے سے ہمیں حظ حاصل ہوتا ہے۔''

۲۔ ''نقل کرنا ہمارے لیے ایک فطری امر ہے جس طرح وزن و آہنگ کا احساس ہماری فطرت میں شامل ہے۔'' (۸)

دراصل اس قسم کے اقوال سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوئیں اور ایسے تصورات ارسطو کی طرف منسوب ہوئے ہیں جن کی کچھ بنیاد تو ہے مگر یہ کاملاً اس کے تصورات نہیں، تاہم اس میں شک نہیں کہ ارسطو بھی افلاطون کی طرح نقالی کو بنیادی چیز مانتا ہے اگرچہ اس کے تصور میں قدرے وسعت ہے یعنی نقل مع شے زائد: یعنی اصل کی وسعت یافتہ صورت جو حسین بھی ہے!

مآخذ

۱۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، **مغرب کے تنقیدی اصول**، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۴ء

2- Martin Gray: *A Dictionary of Literary Terms*, Longman: Yourk Press, 1994, Pg. 146.

۳۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، **ارسطو سے ایلیٹ تک**، اسلام آباد: نیشنل بک فاؤنڈیشن، ۱۹۷۵ء، ص ۵

۴۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، **اشارات تنقید**، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۹۳ء، ص ۱۹

۵۔ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی، **مغرب کے تنقیدی اصول**، ص ۲۶

۶۔ ایضاً، ص ۵

۷۔ ڈاکٹر جمیل جالبی، **ارسطو سے ایلیٹ تک**، ص ۱۰

۸۔ ڈاکٹر سید عبداللہ، **اشارات تنقید**، ص ۴۹